شمس تبریز خان صاحب

الفرڈ گیّوم کی تالیف "اسلام" پر ایک نظر

[زیرِ نظر مقالہ دو اقساط میں شائع کیا جا رہا ہے۔ "عالمِ اسلام اور عیسائیت" کی روایت کے مطابق مقالہ کے حواشی دوسری قسط کے ساتھ شائع ہوں گے۔ مدیر]

الفرڈ گیّوم Alfred Guillaume کا شمار مشہور انگریز مستشرقین میں ہوتا ہے مگر ان کی فکر و نظر میں وہ بے تعصبی جو محقق کی شان ہے نہیں پائی جاتی۔ ان کا تعصب کھلا ہوا نہیں، بلکہ علمی رنگ لیے ہوئے ہے۔ جامعہ ازہر کے استاذ ڈاکٹر محمد البہی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> معاصر انگریز مستشرق ہیں اور اسلام کی مخالفت کے لیے مشہور، انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لکچرار رہ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں اور خیالات پر مشنری اسپرٹ کا غلبہ ہے۔ ان کی کتابوں میں ایک کتاب "اسلام" بھی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مصری حکومت کے طلبہ کے جو وفود بھیجے جاتے تھے انہوں نے مطالعات مشرقیہ کا درس انہی صاحب سے حاصل کیا۔

گیّوم آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایم-اے ہیں اور کلھم کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ڈرہم یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر بھی رہے ہیں۔ سر ٹامس آرنلڈ کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک مشہور کتاب The legacy Of Islam ورثۂ اسلام لکھی جس کے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک ۵ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اس پر "معارف" کے ۵۸ء کے شماروں میں ایک فاضل کے قلم سے تنقید بھی شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے سیرۃ ابن ہشام کا انگریزی ترجمہ بھی مع مقدمہ کے شائع کیا ہے۔

ہم یہاں ان کی کتاب "اسلام" پر ایک تنقیدی نظر ڈال رہے ہیں۔

[باب - ۱، تاریخی پس منظر]

مصنف نے کتاب کے پہلے باب (تاریخی پس منظر) میں عربستان سے مراد آج کے تمام ایشیائی عرب ممالک لی ہے اور یہ بتایا ہے کہ لفظِ عرب کا سب سے پہلا تاریخی حوالہ آشوری بادشاہ شالما نسر سوم

سے متعلق ایک کتبہ میں ملتا ہے جس نے ۸۵۳ ق م میں عربوں اور یہودیوں کی ایک مشترکہ فوج کو شکست دی تھی۔ مصنف نے بتایا ہے کہ عراق، مصر اور شام میں جو لوگ Habiro کہے جاتے تھے، وہ اور عرب در اصل ایک ہی ہیں۔ اس طرح تالمود کے Hebrews گویا عرب تھے--- اور انہی سامی نسلوں نے سمیری تہذیب کی بنیاد رکھی جو عراق و شام فونیکیا اور جنوب عرب میں پھیلی--- اور جنوب عرب میں تو سبائی، معینی اور قطبانی علاقے بہت ہی مہذب تھے جہاں زراعت مواصلاتی نظام اور بیرونی تجارت کی وجہ سے اچھی خاصی خوشحالی پائی جاتی تھی۔ اس تہذیب کی تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح تک جاتی ہے۔ اس علاقے کے عرب بادشاہوں نے دریاؤں پر بند باندھے، قلعے اور مندر تعمیر کیے تھے[۲]۔

نبطی عرب سلطنت پر ۱۰۵ء میں رومیوں نے قبضہ کر لیا لیکن اس سے الحجر اور وادی تیماء کی تجارتی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے شاندار اور مرعوب کن گھر آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں جن کا حوالہ قرآن (۷۴:۷) میں ہے۔

تدمر[۳] (Palmyra) کی مضبوط سلطنت ملکہ زنوبیا یا زینب کی ماتحتی میں وہیں قائم تھی۔ یہاں تک تو ایک عام جائزہ تھا۔ اس کے بعد مصنف نے عرب میں بسنے والی قوموں کا جائزہ لیا ہے اور پہلا نمبر مشرکین کا قائم کیا ہے۔ اس میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے کہ اللات، اللہ کا مؤنث ہے جسے عرب مشرکین دیوی اور خدا کی بیٹی سمجھتے تھے۔ اس کا ذکر یونانی مؤرخ ہیرو ڈاٹس نے بھی کیا ہے اور جاہلی شاعری میں بھی اس کے حوالے آتے ہیں۔ "طائف اس کی عبادت کا مرکز تھا۔ عزّیٰ کی پوجا مکہ میں ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت چوتھی صدی عیسوی سے ملنا شروع ہوتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ نوجوان محمد نے بھی اس پر ایک سفید بھیڑ چڑھائی تھی"۔ اس روایت کی تقویت کے لیے مصنف نے غزوۂ احد کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جس میں مشرکین نے حضور ﷺ اور اصحابؓ کے مقابلہ میں شور مچایا کہ والعزیٰ لنا ولا عزّیٰ لکم (عزّیٰ ہماری ساتھ ہے تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں ہے) لیکن اس سے نبی ﷺ کی (نعوذ باللہ) بت پرستی سے کہیں دور کا بھی ثبوت ملتا ہے؟ حالانکہ ابن اثیر کی ایک روایت میں حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ[۴]

> "میں نے جاہلی اعمال میں سے جب بھی کسی عمل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بچا لیا مگر دو موقعوں پر: ایک موقع تھا کہ میں نے اپنے اس ساتھی سے کہا جو مکہ کی بلندی پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہ تم ذرا میری بکریاں دیکھو میں مکہ جا کر جوانوں کی طرح قصہ گوئی کروں۔ چنانچہ میں مکہ کے پہلے گھر تک پہنچا تھا کہ گانے کی آواز آئی اور مجھے بتایا گیا کہ فلاں کا فلاں سے نکاح ہو رہا ہے تو میں سننے کے لیے بیٹھ گیا لیکن اللہ نے مجھ پر نیند طاری کر دی اور مجھے بالآخر سورج کی تیز دھوپ نے جگایا اور میں اپنے ساتھی کے پاس لوٹ آیا اور اس کے سوال پر اسے بتایا پھر دوسری رات بھی اسی طرح

ہوا۔ لیکن اس کے بعد مجھ سے کوئی جاہلی بات نہیں ہوئی۔"

حضور ﷺ کی اس تصریح کے بعد اب کسی دوسری بات کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد یہود کا ذکر آیا ہے اور عرب میں ان کی آمد کے تین دور ممکن بتائے گئے ہیں۔ آٹھویں صدی قبل مسیح، چھٹی صدی قبل مسیح، یا پہلی دوسری صدی عیسوی۔ پہلا امکان یہ ہے کہ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں عراق میں موجود ہوں۔ اور تیسرا امکان یہ ہے کہ رومیوں کے ڈر سے یہودی فلسطین میں آ کر بسے ہوں۔ تیسرے نمبر پر عیسائیوں کا ذکر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عیسائیت اپنے آغاز ہی سے عرب میں پھیل گئی اور کئی مقامات پر گرجے تعمیر ہوئے خاص طور پر نسطوری اور یعقوبی عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ مصنف نے آغاز اسلام تک عرب عیسائی تاریخ میں حیرہ کے غسانی بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔

اس باب کے آخر میں مسلمان فاتحین کے ہاتھوں روما کے زوال پر اس طرح تبصرہ کیا ہے۔ یونانیوں یا رومیوں نے اپنے زوال کا راستہ خود ہی ہموار کیا جس کے نتیجے میں پہلی ہی صدی ہجری میں مسلم فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچ گئیں اور وہ بالآخر ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

عرب عیسائیوں کے ساتھ رومی آرتھوڈکس عیسائیوں کا سلوک بہت شرمناک تھا۔ ان کی پالیسی احمقانہ اور لغو تھی۔ اس لیے وہ عربوں کی نظر میں بے انصافی کی تصویر تھے۔ چنانچہ خود عیسائیوں نے عیسائیوں سے غداری کی۔ ادھر ایرانی موقع سے فائدہ اٹھا کر شام پر قابض ہو گئے اور عربوں سے ایک حد تک صلح کر لی، لیکن انہوں نے تمام قبائلی یونانیوں کو قتل کر دیا۔ ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ مظلوم عیسائیوں نے ظالموں سے اسی موقع پر اپنا بدلہ لیا۔ یونانی جب ایرانیوں کے دفاع کے لیے آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو مسلم حملے کے بالمقابل پایا۔ اس موقع پر ہمیں یہ پڑھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ جب مسلم قائد نے حمص اور دمشق کے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہیں یونانیوں (رومیوں) کے ظلم سے نجات دلانے آئے ہیں، تو اسے ایک نجات دہندہ کے طور پر خوش آمدید کہا گیا۔ مشرق و مغرب میں عربوں کی نمایاں پیش قدمی دراصل ان عیسائیوں کے تعاون کا نتیجہ تھی جو رومیوں کے ظلم سے نفرت کر رہے تھے۔ عرب بالعموم قلعوں کی محافظ فوجوں کو شکست دیتے تھے جو مقابلتہً آسان چیز ہے۔ اسی وجہ سے شام میں عوام نے ان کا ساتھ دیا اور انہیں خوش آمدید کہا۔ مصر میں عربوں اور مصریوں میں اس شرط پر کہ رومی طاقت کو ختم کر دیا جائے گا صلح قائم ہو گئی۔ یہ اس وقت تک رہی جب تک مقامی باشندوں کو دبانے کی نوبت نہیں آئی۔ مصر اور تمام عرب ملکوں میں مسلم فاتحین کا نجات دہندہ کے طور پر استقبال ہوا۔ (ص ۱۷-۱۸)

اس باب میں مصنّف نے بڑی دراز نفسی سے کام لے کر دکھایا ہے کہ قبلِ نبوت آنحضور ﷺ کے حالات نہیں ملتے۔ اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ انہیں سیرۃ ابنِ اسحاق[۵] کے ایک غیر مطبوعہ مخطوطہ سے ایک ہی مستند واقعہ ملا ہے کہ حضور ﷺ نے زید بن عمر بن نفیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انھی نے سب سے پہلے مجھے بت پرستی پر سرزنش کی اور اس سے روکا ہم اور زید بن حارثہ طائف کے سفر میں ان سے ملے تو ہم نے بتوں پر چڑھائے گئے گوشت کو ان کے سامنے رکھ کر کھانے کے لیے کہا لیکن انہوں نے نہیں کھایا اور کہا کہ بھتیجے! تم جانتے ہو کہ میں ایسا گوشت نہیں کھاتا اور اس کے بعد بت پرستی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ بت بے کار چیز ہیں وہ کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد سے میں بتوں اور بت پرستی کے قریب نہیں گیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے مجھے پیمبری سے نوازا۔ (ص ۲۶)

اس کے بعد لفظ نبی کے مختلف معانی دے کر اس کے اصل معنی اور اسلامی مفہوم کو الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ "سامی لوگوں میں نبی پیش گوئی کرنے والے کو کہتے ہیں لیکن یہودی مذہب میں نبی وہ ہے جس پر ناقابلِ ضبط جذبات گزرتے ہیں اور وہ جو کہتا ہے اس سے اس کے سامعین خدائی صفات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں توحید کے داعی اور سماجی انصاف کے مبلغ کے معنی بھی پیدا ہو گئے۔

مشرکین عرب کے ہاں خدا کا صحیح تصوّر ہی نہ تھا وہ نبی کا بدل شاعر کو سمجھتے تھے جو جن یا شیطان سے علم حاصل کرتا تھا۔ یہ معنی لکھ کر موصوف معصومیت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ " اب کس طرح یہ کہنا ممکن ہوگا کہ محمد نبی تھے؟" (ص ۲۸)

اس کے بعد نزول وحی اور حضرت جبرئیل کی آمد کو خواب و خیال Intutions and Dreams بتایا ہے (ص ۲۹)

پھر اسلامی تعلیمات کو یہودیت و مسیحیت سے ماخوذ بتا کر ایک جملہ ایسا لکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید، پیغمبر کی تصنیف ہے۔ موصوف کا جملہ یہ ہے کہ "پیغمبر قرآن میں کہتے ہیں" (ص ۳۴)

مصنّف نے اگلا باب قرآن پر لکھا ہے اس میں بھی اسی دعوے کی تکرار ہے۔

غزوۂ بدر کی تمہید مصنّف نے اس طرح باندھی ہے کہ وہ سراسر مسلمانوں کا جارحانہ حملہ معلوم ہو۔ مشرکینِ مکّہ کی چھیڑ چھاڑ کا کہیں ذکر نہیں۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ لوگوں کو آمادۂ جنگ نہ پا کر پیغمبر ﷺ نے جہاد کو ایک مقدس لڑائی کی شکل میں پیش کیا۔ غزوۂ بدر کے اسباب کے آغاز کو

سرحدی جھگڑا Frontier Incidents بتایا گیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ مسلمانوں نے شہر حرم کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اسی طرح غزوۂ بدر کو Defence کی جگہ Attack سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ اس کے بعد محمد ﷺ نے حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جو یہود کے حجاز سے اخراج تک چلتا رہا۔ یہود نے محمد ﷺ کی پیغمبری کا بدلائل اور بہ تمسخر انکار کر کے انہیں مشتعل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی معاشی بالادستی بھی ایک وجہ اشتعال تھی۔ یہود کے ساتھ کشمکش کے بعد محمد ﷺ نے ان کے قبلہ کو ترک کر کے کعبہ کی طرف رخ کر لیا، (ص ۴۳-۴۴)

غزوۂ احد کے بعد غزوہ ذات السویق کے ذکر میں موصوف نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ کا احد کے زخموں سے چور ہونے کے باوجود قریش کا پیچھا کرنا ہی ایک ایسا واقعہ ہے جو ان کی روح کو بتاتا ہے۔ احد کی "شکست" پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اپنے جذبات چھپا نہیں سکے لکھتے ہیں۔

> اگر بدر اس بات کا ثبوت تھا کہ خدا محمد ﷺ کا طرف دار ہے تو غزوۂ احد کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ اس شکست کے بعد مدینے میں ہر طرف ماتم بپا تھا اور جن کے عزیز اس جنگ میں مارے گئے تھے وہ محمد ﷺ کو الزام دے رہے تھے۔ (ص ۴۵)

مجھے سیرت کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملا کہ غزوۂ احد کے بعد مدینے میں لوگ حضور ﷺ کو الزام دے رہے تھے۔ یہ کسی منافق کی طرف سے ہوا وہ تو ہوا ہو لیکن کسی مسلمان چہ جائیکہ صحابی کی یہ شان نہیں کہ وہ نبی کو الزام دینے لگے۔ سیرت کی کتابوں میں اتنا آتا ہے کہ حضور ﷺ نے جب شہدا کا ماتم سنا تو فرمایا کہ اما حمزہ فلا بواکی لہ (حمزہ کا رونے والا کوئی نہیں؟) اس پر انصار کی کچھ عورتیں آئیں اور انہوں نے حضرت حمزہ کا ماتم کیا۔

بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کے یہودیوں کے اخراج کو جارحیت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا لیکن یہود کی مسلسل ریشہ دوانیوں، سازشوں اور بد عہدیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ تاریخی حقیقت ہیں۔ اس کے بعد فتح مکہ کا ذکر خیر ہے اور آنحضور ﷺ کے طرز عمل کو سراہا گیا ہے۔

> حرم مقدس کے حدود متعین کیے گئے۔ کعبہ مرکز اسلام قرار پایا۔ فتح کے لمحات میں محمد ﷺ نے بڑی اولوالعزمی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔ صرف ۴ آدمی اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ ان میں سے تین تو مجرم تھے، چوتھی ایک لڑکی تھی جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہجویہ اشعار پڑھتی تھی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی نرم دلی قابل تعریف تھی۔ شہر مکہ نے انہیں خدا کا رسول تسلیم کر لیا تھا اور چند ہفتوں میں یہ عالم تھا کہ مکہ کے لوگ رسول اللہ کے پرانے جاں نثاروں کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ (ص ۵۱)

آخر میں آنحضرت ﷺ کی زندگی پر تبصرہ کرنے پر مصنف اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ "قابل اعتماد روایات ایک ممتاز لیاقتوں کے انسان کی تصویر کھینچتی ہیں جو لوگوں کے دل جیت لیتا تھا، بات چیت

اور عدم تشدد سے اپنے دشمنوں کو قائل کر دیتا تھا۔ اگر ہم معجزات کے متعلق چلی ہوئی ان روایتوں کو نظر انداز کر دیں (جن کے بارے میں خود پیغمبر کو کوئی دعویٰ نہ تھا) تو وہ ایک عظیم تاریخی شخصیت کے طور پر کھڑے نظر آتے ہیں"۔ (ص ۵۳)

باب - ۳، قرآن

اس باب کی تمہید میں مصنف نے دکھایا ہے کہ قرآن انہی معنوں میں کلامِ خدا ہے جن معنوں میں یہ عیسائیت اور یہودیت میں متعارف ہے۔ اس کے بعد وحی کی کیفیت اور قرآن میں روح کے مختلف معانی دے کر نفسِ وحی کے مفہوم کو الجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ:

> قرآن جیسا کہ آج ہم اسے پاتے ہیں وہ ان اقوال کا مجموعہ ہے جو محمد ﷺ نے وقتاً فوقتاً کہے تھے یہ شبہ سے بالاتر ہے کہ اس کے سننے والوں نے اس میں وحی کی علامات پائی تھیں۔ (ص ۵۶)

اس کے بعد قرآن کو کھلے طور پر کلامِ رسول ﷺ کہا گیا ہے اور محفوظیتِ قرآن میں اس طرح شبہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> "نبی کے الفاظ کی تحریر شروع میں بالکل اتفاقی تھی (یعنی کبھی لکھ لی گئی، کبھی نہیں لکھی گئی۔ مترجم) قرآن کی آیات کھجور کی پتیوں، پتھروں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی گئیں اور تحریر کا کام حضرت عمرؓ کے زمانے میں انجام پایا۔۔ بالآخر قرآن کے مختلف صحیفوں کے باہمی فرق کو دیکھ کر حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ کی سرکردگی میں ترتیب قرآن کی ایک کمیٹی بنا دی۔ لیکن کوفے والوں نے اس عثمانی ایڈیشن کو نہیں مانا اور وہ ۱۰۰۰ء تک اپنے نسخے کو پڑھتے رہے۔ عام طور پر قرآن کا عثمانی ایڈیشن ہی مسلمانوں میں بطورِ کلام الٰہی رائج ہو گیا۔ قرآن میں الفاظ اور قرأت کا فرق تسلیم شدہ ہے اور خط کوفی میں لکھے ہوئے قرآن میں بھی فرق پایا جاتا ہے ۔۔۔ اس طرح معلوم ہوا کہ متن قرآن کی تاریخ بھی بائبل کی تاریخ سے ملتی جلتی ہے (ص ۵۷، ۵۸)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مصنف نے اختلافِ نسخ کی جو بات کہی ہے وہ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ قبائلِ عرب قرآن کو اپنے اپنے لہجوں اور آوازوں میں پڑھنے کے مجاز تھے، متنِ قرآن میں فرق صرف ابنِ مسعودؓ کی قرأت میں کہیں کہیں ہے لیکن ایک فرد کا سو یا شاذ روایت مان کر امت اسے ترک کر چکی ہے اور عہد صحابہؓ بلکہ عہد نبوت سے قرآن کی قرأت بھی متواتر اور مسلسل چلی آرہی ہے علماء کا فیصلہ ہے کہ "تواتر بھی قرآن کی ماہیت کا جزو ہے۔ اس لیے نادر اور شاذ تلفظ کو جسے

مستند سات قاریوں کی تائید حاصل نہ ہو قرآن نہیں کہا جاتا نہ اس کے پڑھنے سے نماز صحیح ہوتی ہے"۔

قاہرہ یونیورسٹی کے لاکالج کے پروفیسر عبدالوہاب لکھتے ہیں[7]۔

"قرآن کا متن بلا اختلاف برابر نقل ہوتا آرہا ہے اور جو معدودے چند غیر متواتر قرأتیں پائی جاتی ہیں ان کا شمار قرآن میں نہیں اور نہ ان پر قرآن سے متعلق احکام نافذ ہوں گے"۔

گیّوم نے قرآن میں الفاظ اور قراءتوں کے اختلاف کو اختلافِ متن کہا ہے۔ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض راویوں کے سننے میں جو تھوڑا سا فرق ہوا، اسے انہوں نے ایک الگ قرآنی نسخہ قرار دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ احادیث کے بیشتر مجموعوں میں ابواب القرآن عن رسول اللہ ﷺ کے عنوان سے ان اختلافات کو لکھ لیا گیا ہے اور کسی میں کوئی بڑا فرق نہیں، علاوہ بریں یہ تمام روایتیں متواتر اور قوی نہیں بلکہ شاذو نادر کا حکم رکھتی ہیں۔

مثلاً ایک صحابی کی روایت میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے بجائے مالک یوم الدین کے ملک یوم الدین پڑھا، ان النفس بالنفس والعین بالعین پڑھا هل یستطیع ربک کی جگہ هل تستطیع ربک پڑھا اِنَہ عَمَلَ غَیرُ صَالح کی جگہ اِنَہ عَمِلَ غَیرَ صَالح پڑھا، یا فَرُوحُ وَ رَیحَانُ کی جگہ فَرُوحُ وَ رَیحَانُ پڑھا[8]۔

ناظرین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اوّل تو یہ اختلافات بہت معمولی ہیں اور پھر یہ غیر معروف قراءت کا حکم رکھتے ہیں اس کے ساتھ ان حدیثوں کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جن میں کہا گیا ہے کہ قرآن سات لہجوں میں نازل ہوا۔ ترمذی کی روایت ہے[9]۔

عن ابی بن کعب قال لقی رسول اللّٰہ جبرئیل فقال یاجبرئیل انی بعثتُ الی امتہ امیّین منهم العجوز و الشیخ الکبیر والغلام والجاریتہ والرجل الذی لم یقرأ کتاباً قط قال یا محمد! ان القرآن انزل علی سبعتہ احرف۔

ابن کعب سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ملاقات میں حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ میں امی قوم میں بھیجا گیا ہوں جس میں بوڑھے، بچے اور باندی غلام اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اس پر جبرئیل نے کہا "قرآن سات لہجوں میں نازل ہوا ہے۔

ہشام بن حکیمؓ اور حضرت عمرؓ کی مختلف قراءتوں کو حضور ﷺ نے صحیح قرار دیتے ہوئے فرمایا[10]۔ ان هذا القرآن انزل علی سبعتہ احرف فاقروٗ امّا تیسرمنہ (یہ قرآن سات لہجوں میں اترا ہے جس میں آسان ہو، پڑھو) علامہ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ - ۱۵۷۸ء) "سبعتہ احرف" کی تشریح کرتے ہیں کہ"۔

اس کا تعلق بولنے کے طرز اور لہجے سے ہے جیسے ادغام یا اس کا ترک تفخیم وغیرہ قرأت

کی صورتیں۔ عربوں کے لہجے مختلف تھے اس لیے آپ نے ان کی رعایت کی اور انہیں اپنے آسان طرز پر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن قرآن کے تحریری متن کے لیے قریشی لہجے کو متعین کر دیا۔ طحاوی کہتے ہیں کہ یہ سات لہجے قبائلی زندگی میں تھے بعد میں عربی ترقی کر کے اب قرآن کے قریشی لہجے تک آ گئی ہے اور یہی لہجہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ [12] "عبدالرحمٰن بن سلمیؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، زید بن ثابتؓ اور مہاجرین و انصار کے قرآنی لہجے ایک تھے۔ ابن الانباری نے کتاب المصاحف میں تصریح کی ہے کہ ان کا اختلاف الفاظ اور تہجی میں نہ تھا بلکہ لہجوں میں تھا۔

مستشرقین عام طور پر حضرت عثمانؓ کے لقب، جامع القرآن کو غلط معنوں میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کی تدوین انہی نے کرائی اور انہوں نے قرآن کے اختلافی نسخوں کو ختم کر دیا، حالانکہ حضرت عثمانؓ نے صرف یہ کیا کہ قرآن کو لغت قریش کے مطابق لکھوا کر بلاد اسلامیہ میں شائع کرا دیا۔ مکمل قرآن خود حضور کی زندگی میں لکھا جا چکا [13] قسطلانی شارح بخاری لکھتے ہیں وقد کان القرآن کلہ مکتوبا فی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضوع واحد" (قرآن عہد نبوی میں لکھا جا چکا تھا لیکن ایک جگہ جمع نہیں ہوا تھا)

سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اتقان میں حارث محاسبی کا قول نقل کیا ہے کہ:

"المشہور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذالک انما حمل عثمان الناس علی القراۃ لوجہ واحد"

لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمانؓ جامع القرآن ہیں، یہ صحیح نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو ایک طرز پر قرآن پڑھنے پر جمع کیا۔

سر ولیم میور لکھتے ہیں۔

"کوئی جزء، کوئی فقرہ کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جو جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو اور نہ ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اس مسلم مجموعے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو ضرور تھا کہ ان کا تذکرہ ان احادیث میں پایا جاتا جن میں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال کی نسبت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہوں۔

جہاں تک قرآن کی تعلیمات کا ذکر ہے مصنف نے اس کے ساتھ کچھ انصاف کیا ہے اسی ضمن میں لکھتے ہیں۔

مسلمان موت سے نہیں ڈرتا اس لیے کہ وہ جنت کا دروازہ ہے۔ صبر و توکل اس کے لیے

لازمی ہیں۔ وہ عزم و ہمت کے ساتھ زندگی کی دشواریوں اور آزمائشوں میں داخل ہوتا ہے اور ہر دم خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس سے تو انکار کوئی متعصب شخص ہی کر سکتا ہے کہ ان اقدار نے پہلے بھی اعلیٰ کردار اور دیانت دار لوگ پیدا کیے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام بھی مسلم معاشرے کو اصول کا پابند نہیں رکھ سکا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعد کی صدیوں کے علماء ہی اسلامی معاشرے کے زوال و اضمحلال کے ذمہ دار ہیں خاص طور پر وہ جنھوں نے اپنے من مانے عقائد و نظریات ایجاد کیے جنہیں پیغمبر ﷺ یقیناً رد کر دیتے" (ص ۶۴-۶۵)

لیکن اس کے منصف کو عورتوں کے ساتھ قرآن کا رویہ پسند نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"قرآن میں عورتوں کو مردوں کی کھیتیاں کہا گیا۔ اسی طرح عقد کے لیے نکاح کا لفظ استعمال ہوا جو فعل ہم بستری کے لیے وضع ہوا ہے۔ اسی طرح شادی کا اوّلین مقصد افزائشِ نسل قرار دیا گیا ہے۔ مردوں کو عورتوں کے بر خلاف طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح عورت کو مارنے اجازت ہے۔ اس طرح اسلامی اور مسیحی دنیا میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں میں بھی اب روشن خیالی پیدا ہو چلی ہے (ص ۷۱ - ۷۲)

اس سلسلے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہر زبان میں اسلامی طرز معاشرت پر کتابیں موجود ہیں[۱۴] مصنّف نے یہاں جو اعتراضات کیے ہیں، انہیں صرف لفظوں کا پکڑ لینا کہہ سکتے ہیں "حرث" قرآن میں موقع ذم میں نہیں آیا بلکہ تخلیق Creation کے ایک رمز Symbol کے طور پر آیا ہے۔ اسی طرح نکاح، عربی میں عام طور پر فعل ہم بستری کے بجائے "عقد" و ازدواج، کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ اسلام نے شادی کا اوّلین مقصد کہیں متعین نہیں کیا بلکہ ایک بڑا مقصد بقائے نسل کو قرار دیا ہے مگر کسی بھی نیک مقصد سے انکار نہیں کیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو خلع کا حق دے کر اسے بھی مجبور کے بجائے با اختیار بنا دیا ہے۔ رہا ضرب و تہدید کا سوال تو وہ ایک آخری چارہ کار ہے اور مرد کی صوابدید اور ذاتی حالات پر منحصر رہے کوئی اٹل حکم نہیں۔

یہاں مصنّف نے "جہاد" کے تصوّر کا خوب مذاق اڑایا ہے اور کہا ہے کہ:

وقتاً فوقتاً یہ صدا اٹھتی ہے اور برطانیہ کے خلاف بھی دو بار مصنّف کی زندگی ہی میں اٹھ چکی ہے لیکن عملاً وہ ایک حرفِ معطّل Dead Letter ہے یوں تو ہر غیر مسلم سے جب تک وہ جزیہ نہ ادا کرے جہاد کا حکم ہے۔ لیکن آج کسی مغربی طاقت کے خلاف جہاد مقامی مسلح مزاحمت کی صورت میں ناممکن ہے اور وہ جہاد جو کسی غیر مسلم طاقت سے مل کر کیا جائے، کسی طرح جہاد نہیں[۱۵]"۔ (ص ۷۲)

یہاں پہنچ کر مصنّف نے پھر وہی پرانا راگ چھیڑا ہے کہ

"قرآن کی تعلیمات پیغمبر نے وقت اور حالات کو سامنے رکھ کر پیش کی تھیں۔ ۷ ویں صدی کے لیے آج کی صدی تو ایک ان دیکھا خواب تھی پھر اس کا اطلاق آج کے حالات پر کیسے ہو سکتا ہے؟ مثال کے طور پر قرآن میں دن بھر کے روزے کا ذکر ہے لیکن قطب شمالی کے علاقے Arctic Circle میں یہ کیوں کر ممکن ہے جہاں گرمیوں میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا[۱۶]۔ (ص ۷۳)

مستشرقین کا انداز عجیب ہے کہ اگر اسلام کے محاسن کا ذکر ناگزیر ہے تو اسے بڑے دھیمے اور پست لہجے میں کہہ کر گزر جائیں گے، لیکن محاسن و معائب دونوں کے تذکرے سے قاری پر یہ اثر ڈالنا مقصود ہوتا ہے کہ مصنف حقیقت نگار اور منصف مزاج ہے ہمارے مصنف بھی اس باب کے آخر میں قرآن کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

"قرآن عالمی ادبیات میں سے ایک ہے جس کا کوئی ترجمہ اصل کی خوبیوں کا حامل نہیں ہو سکتا۔ وہ توازن و ترنم کا ایک خاص حسن اور وہ زیر و بم Cadence رکھتا ہے جو کانوں کو بھلا لگتا ہے بہت سے عیسائی عرب اس کا کھلا اعتراف کرتے اور بیشتر عربی داں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ جب وہ ترتیل سے پڑھا جاتا ہے تو سامع پر خواب آگیں Hypnotic اثر ڈالتا ہے اور بعض اوقات اس کی انوکھی نحوی ترکیب اور ناگوار Repellent مضامین بھی گوارا بن جاتے ہیں۔ اس کی زبان کی شیریں موسیقی نے تنقیدی آوازوں کو خاموش کر رکھا ہے اور اسی نے اعجاز قرآنی کے عقیدے Dogma کو پیدا کیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ عربی لٹریچر میں نظم ہو یا نثر اس جیسی بلند، وسیع اور زرخیز Fecund کوئی کتاب نہیں جو اس کے مقابل میں آسکے"۔ (ص ۷۳-۷۴)

(دوسری قسط ماہ فروری ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے)